⊙ عابد حسین

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

بلوچستان میں اُردو افسانہ: ابتدائی نقوش و رجحانات

Abstract:

Urdu is not only prevalent in Balochistan as a language of communication, but also has a vast scholarly literature of the region. In Balochistan, written literature started in Urdu. Along with Urdu fiction in the subcontinent, fiction writing in the Urdu language had also started in Balochistan. In there was a significant increase after the formation of Pakistan. From the formation of Pakistan to the end of one unit, Urdu fiction had stood on its feet in the province. Dozens of fiction writers were presenting their works in various newspapers and magazines. Urdu fiction in Balochistan was started by those who were politically and journalistically active, so the fictional literature here seems to be connected with the political and social movement of the region from the beginning. It simultaneously carries a message of romanticism and social reform. In the paper under review, the same tradition and trends of Urdu fiction in Balochistan have been marked.

Keywords:

Urdu Fiction,Short Story, Balochistan,Progressivism,
Mir Yousaf Aziz Magsi, Inam ul Haq Kausar, Shah Muhammad Marri

بلوچستان میں اُردو افسانہ: ابتدائی نقوش

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی اُردو نثر نے بلوچستان میں اپنے قدم جمانے شروع کر دیے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک یہاں کی سرزمین میں اس کی جڑیں مضبوطی سے پیوست ہو چکی تھیں۔ بالخصوص اخبارات کے اجرا کے بعد اردو میں شاعری کے علاوہ مضامین اور افسانے کا رجحان زور پکڑ چکا تھا۔ سن تیس کی دہائی کے ابتدائی برسوں

میں ہی افسانوی ادب کے ابتدائی نقوش ہمیں بلوچستان میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔اور پھر یہیں ہمارا سابقہ یوسف عزیز مگسی ہی کی تحریر کردہ اولین اُردو افسانوی تحریر سے ہوتا ہے۔جس کی اشاعت کی تفصیل ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے کچھ یوں پیش کیا ہے:

''تکمیلِ انسانیت (طبع زاد افسانہ)، از محمد یوسف علی عزیز مگسی (چار قسطیں)، مطبوعہ 'بلوچستان جدید' کراچی، شمارے: یکم مئی ۱۹۳۴ء، ۸ر مئی ۱۹۳۴ء، ۱۶ر مئی ۱۹۳۴ء، ۲۴ر مئی ۱۹۳۴ء۔''(۱)

البتہ اس کا مکمل متن پہلی بار ۲۰۱۶ء میں بلوچستان یونی ورسٹی میں یوسف عزیز مگسی چیئر کے قیام کے بعد اس کے چیئر پرسن ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کھوج کر کتابی صورت میں شائع کیا۔(۲) عموماً اب تک کی تحقیق کے مطابق یوسف عزیز مگسی کی اسی تحریر کو بلوچستان میں اردو کی اولین افسانوی تحریر مانا جاتا ہے۔گو کہ بعض ناقدین اسے افسانے کے مروجہ فنی لوازم پہ پورا اترتے ہوئے نہیں پاتے، لیکن متفقہ طور پر یہی تحریر بلوچستان میں اردو کا اولین افسانہ یا افسانوی تحریر کہلائی جاتی رہی ہے۔یوسف عزیز کے اس افسانے کو ان کا سوانحی خاکہ بھی کہا جاتا ہے۔افسانے کی کہانی کے تناظر میں یہ تاثر درست معلوم ہوتا ہے۔کہانی کے مرکزی کردار کا نام بھی عزیز ہی ہے، جو ایک نواب کا بیٹا ہے۔یہ کل تین بھائی ہیں۔کہانی کے مطابق والد کی وفات کے بعد بڑا بھائی دونوں چھوٹے بھائیوں پر ظلم ڈھاتا ہے اور انھیں جائیداد سے بے دخل کر دیتا ہے۔دوسری طرف ملک میں آزادی کی تحریک چل رہی ہے۔عزیز اس سے شدید متاثر ہوتا ہے اور اس کے حق میں مضمون بھی لکھتا ہے۔جس کی پاداش میں اسے قید کر لیا جاتا ہے۔افسانے کے اختتام میں عزیز احمد فرشتوں سے مکالمہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو جاتا ہے، جس میں وہ اپنے بھائیوں کی اصطلاح اور وطن کی آزادی کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

یوسف عزیز مگسی کی نجی زندگی عین اس افسانے کا عکس ہے۔انھیں بھی جائیداد سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ آزادی وطن کے حوالے سے انھوں نے مشہورِ زمانہ مضمون 'فریادِ بلوچستان' لکھا۔جس پہ انگریز نے انھیں قید کر لیا۔بعد ازاں وہ کوئٹہ کے خونی زلزلے میں الم ناک موت سے دوچار ہوئے۔مجموعی طور پر ان کے افسانے میں مزاحمتی اور اصلاحی رنگ غالب ہے۔وطن کی آزادی سے متعلق ان کا رویہ مزاحمتی جب کہ سماجی امور سے متعلق اصلاحی ہے۔یوں افسانہ ایک المیاتی انجام سے دوچار ہو کر مقصدیت کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔البتہ ۲۰۰۶ء میں بلوچستان کے ایک نام ور محقق و معلم پروفیسر ڈاکٹر ضیاالرحمان نے اپنی تحقیق میں یہ دعویٰ کیا کہ نہ تو 'تکمیلِ انسانیت' بلوچستان کا پہلا افسانہ ہے اور نہ یوسف عزیز مگسی بلوچستان کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔تحقیق پر مبنی ان کا یہ مضمون قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ و ریسرچ سینٹر کوئٹہ سے شائع ہونے والے معروف علمی و تحقیقی مجلّہ 'قلم قبیلہ' کے سن ۲۰۰۶ء کے سال نامے میں 'کیا تکمیلِ انسانیت بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ ہے؟' کے عنوان سے شائع ہوا۔اپنے اس مضمون میں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ،

''بلوچستان میں اُردو کا پہلا افسانہ 'ایک رازِ سربستہ کا انکشاف یا غیبی امداد' ہے۔جس کے مصنف مکران کے محمد عمر بلوچ ہیں۔یہ مختصر افسانہ کراچی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'البلوچ' میں ۷ر مئی ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا۔یعنی اس کی اشاعت 'تکمیلِ انسانیت' کی اشاعت سے ایک سال ۱۹ دن پہلے ہو چکی تھی۔''(۳)

اپنے دعوے کی حقانیت کے بہ طور انھوں نے نہ صرف مضمون کے آخر میں مذکورہ افسانے کا مکمل متن درج کیا ہے، بلکہ حواشی میں تفصیلاً بتایا ہے کہ اس تحریر کو ٹیسٹنگ کے جدید مراحل سے بھی گزارا گیا۔ یعنی طلبا، اساتذہ اور محققین کے ایک گروپ کے سامنے اسے بہ طور ایک تحریر پیش کیا گیا اور ان سے اس کی صنف اور سنِ تحریر سے متعلق پوچھا گیا۔ اکثریت نے اسے افسانہ قرار دیا اور سن تیس کی دہائی کو اس کا مجوزہ سنِ تحریر قرار دیا۔ افسانہ کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سماجی اصلاحی رجحان پر مبنی ہے۔ جس میں ایک نوجوان کو ایک پری نما مخلوق آ کر مسلمانوں کی زبوں حالی کا حال سناتی ہے اور پھر اس کا حل یہ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کے احکامات سے کما حقہ آگاہی اور ان پہ عمل درآمد کی ضرورت ہے، تبھی وہ پستی کے ان گڑھوں سے نکل سکتے ہیں۔ وہ یہ 'راز' نوجوان کو بتا کر غائب ہو جاتی ہے اور اس سے عہد لیتی ہے کہ وہ یہ راز مسلمانوں کو جا کر بتائے گا کہ اگر وہ اسلام کے احکامات پر عمل درآمد یقینی بنائیں تو محض ایک دہائی کے اندر ان کی فتح یقینی ہوگی۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ افسانہ، جسے حالیہ تحقیق کی رُو سے بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا جا رہا ہے، سماجی اصلاحی رجحان کا حامل نظر آتا ہے۔ بریں بنا، اس تحقیق کی رُو سے گویا یوسف عزیز مگسی کا افسانہ 'تکمیلِ انسانیت' اولین افسانہ قرار نہیں پاتا۔ البتہ اس کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ تحقیق میں کچھ بھی حتمی نہیں ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ اس بابت آئندہ ہونے والی تحقیق کسی اور نتیجے پر پہنچے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ضیاالرحمان نے بھی اپنے مذکورہ مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ 'البلوچ' کے مزید پرچے سامنے آنے پر اس بابت مزید کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے (۴)۔ بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لینے والی مسز مبارکہ حمید نے اپنی تحقیق میں اس ضمن میں یوسف عزیز کے بعد دوسرا نام ناصر بلوچستان کا درج کیا ہے۔ ان کے مطابق،

> ''ناصر بلوچستان کا افسانہ 'عروسِ عجم' کے نام سے جیکب آباد سے شائع ہونے والے 'الحنیف' میں فروری ۱۹۳۷ء کے سال نامہ میں ص نمبر ۷۸۔۸۱ پہ شائع ہوا۔'' (۵)

ان کے مطابق اس کے بعد اردو افسانے کا تسلسل ہمیں ہفت روزہ 'پاسبان' کوئٹہ میں نظر آتا ہے، جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء کے مابین شائع ہوتا رہا۔ اس میں بیس تا پچیس افسانے شائع ہوئے، جن پر کسی مصنف کا نام تحریر نہیں۔ جس سے اغلب امکان یہی ہے کہ انھیں 'پاسبان' کے مدیر نے مختلف عالمی زبانوں کے افسانوں کے مرکزی خیال سے ماخوذ کر کے تحریر کیا ہے۔ 'پاسبان' میں جو افسانے شائع ہوئے ان کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں: انصاف، دیوتا، گوشت کا ٹکڑا، بھکارن، بڈھا قلی، قاتلہ، اختتامِ سفر، بھونچال، مہاجن، بھوکی، کھوٹا روپیہ، مصیبت زدہ، دکھی جوانیاں، خدا کی دین، تابوت، رادھیکا، نیک دل مطرب، دیوالی، افلاس۔

اکثر افسانوں کے موضوعات معاشی وسماجی مسائل کے گرد گھومتے ہیں۔ جیسے 'انصاف' میں طبقاتی نابرابری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'دیوتا' میں مروجہ سیاسی نظام کی عکاسی کی گئی ہے۔ 'گوشت کا ٹکڑا'، 'بھکارن' اور 'بڈھا قلی' غربت اور تنگ دستی کے موضوع پر مبنی ہیں۔ جن میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غربت، سماجی ناہمواریوں، جرائم اور بے راہ روی کو جنم دیتی ہے۔ 'قاتلہ' میں بھی ایک غریب عورت کی کہانی ہے جو اپنے بچے کی بھوک کے باعث قتل جیسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھتی ہے۔ 'اختتامِ سفر' لڑکیوں کی کم عمری کی اور بے جوڑ شادیوں کے نتائج پر مبنی المیاتی کہانی ہے۔ 'بھونچال' میں ایک مردانہ

سماج میں بیوگی اور یتیمی کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔'مہاجن' میں سرمایہ داری کے سودی نظام کا عکس دکھایا گیا ہے، جہاں ایک ضرورت مند کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنا گردہ بیچنا پڑتا ہے۔'بھوکی' میں ایک بھوکی عورت کا الم ناک منظر دکھایا گیا ہے۔'کھوٹا روپیہ' ایک محنت کش موچی کی غربت کی داستان بیان کرتا ہے۔'مصیبت زدہ' سرمایہ دار کی غریب کی بیوی پر نظر رکھنے اور مایوسی کی صورت میں اسے نوکری سے محروم کرنے کی کہانی ہے۔'دکھی جوانیاں' بے روگاری کے المیے کو بیان کرتا ہے۔'خدا کی دین' میں ایک چور، ایک رقاصہ کی جان بچاتا نظر آتا ہے، یہاں اصلاحی رجحان غالب ہے۔ 'تابوت' سیاسی جکڑ بندیوں کا المیہ ہے، جس میں ایک عورت اپنی بچی کو سپاہیوں سے بچانے کے لیے تابوت میں ڈال دیتی ہے اور آخر میں بچی تابوت میں ہی مر چکی ہوتی ہے۔'رادھیکا' ایک یتیم ہندو لڑکی کی کہانی ہے، جو اپنے مسلم ہمسائے کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر اسی سے شادی کر لیتی ہے۔ یہ ہندو مسلم بھائی چارہ کو بیان کرتی ہے۔'نیک دل مطرب' میں ایک موسیقار کی جدوجہد کی کہانی بیان کی گئی ہے۔'دیوالی' میں ایک بار پھر غربت کو موضوع بنایا گیا ہے۔'افلاس' نام ہی سے ظاہر ہے کہ بھوک و افلاس کے موضوع پر مبنی ہے۔

یوں مجموعی طور پر یہ افسانے غربت، تنگ دستی اور معاشی ناہم واریوں کو بیان کرتے ہیں، جو اُس زمانے کے عمومی مسائل تھے۔ان میں سیاسی مسائل کا بھی تذکرہ ہے اور سماجی سطح پر ہونے والی اتھل پتھل کا عکس بھی نظر آتا ہے۔گویا بلوچستان میں اردو افسانوی ادب کی ابتدا ہی سماجی جڑت سے ہوتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اُس عہد میں بھی لکھنے والے عصر کے مسائل سے لاتعلق نہیں۔اس تناظر میں ان افسانوں سے متعلق مبارکہ حمید کی یہ رائے صائب ہے کہ:

> ''بلوچستانی ادب خصوصاً افسانہ بھی قومی سطح کے سماجی، معاشرتی، جغرافیائی اور سیاسی حالات سے متاثر ہوا۔''(۶)

بلوچستان میں اُردو افسانہ: قیامِ پاکستان کے بعد

ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں اگست ۱۹۴۷ء میں مسلم اکثریتی علاقوں پر مبنی، پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا۔جس کے نتیجے میں سرحد کے دونوں جانب لاکھوں انسانوں نے ہجرت کی۔ ہزاروں انسان کشت و خون کا شکار ہوئے۔تہذیبی اتھل پتھل ہوئی۔زبان بھی تقسیم ہوئی۔ ہندوستان میں رہ جانے والی زبان ہندی کہلائی، جب کہ پاکستان میں اُردو رائج ہوئی۔

بلوچستان، تاریخی طور پر ہندوستان سے الگ تھلگ ایک آزاد ریاست رہا تھا۔انگریزوں نے مختلف معاہدات کے تحت اسے اجارے پر حاصل کیا تھا، اس لیے انگریز کے جانے کے بعد طے شدہ معاہدوں کے تحت مستجار علاقوں کو آزاد کر دیا گیا۔البتہ انھیں کسی بھی ریاست میں شمولیت اختیار کرنے کی آزادی بھی دی گئی۔ ریاست قلات، قیامِ پاکستان سے تین روز قبل یعنی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی آزادی کا اعلان کر چکی تھی۔ بعد ازاں پاکستان کے بانی رہ نما محمد علی جناح، جن کے خان قلات سے قریبی روابط تھے، کے اصرار پر خان قلات نے ایوانِ قلات کی مرضی کے برخلاف قلات کو پاکستان میں ضم کر دیا۔اس دوران ریاست قلات اور کوئٹہ ریجن میں اردو میں تحریر و تقریر کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ تیزی سے پنپنے لگا۔اس زمانے میں اُردو افسانوی ادب کی بھی ترویج ہوئی۔ نئے ملک کے قیام کے ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کی

کچھ آزادی میسر آئی تو اہلِ قلم نے اس میں اپنا خاطر خواہ حصہ ڈالا۔ برسوں کی گھٹن سے نکلتے ہی لکھاریوں نے کھلی فضا میں سانس لینا شروع کیا۔ ۱۹۴۷ء کے اولین ایام میں جو افسانہ نگار ہمیں نمایاں طور پر ابھرتے نظر آتے ہیں، وہ سید خلیل احمد اور پروفیسر انور رومان ہیں۔ سید خلیل احمد کا افسانوی مجموعہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں ہی سامنے آ چکا تھا۔ 'خمارِ زہر آلود' کے نام سے یہ مجموعہ قلات پبلشرز مستونگ کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ ۵۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں کل تین طویل افسانے شامل ہیں۔ حالاں کہ طوالت کے لحاظ سے یہ ناولٹ کی ذیل میں آتے ہیں، لیکن تکنیک اور پلاٹ کی مناسبت سے مصنف نے انھیں افسانہ ہی لکھا ہے۔ انور رومان قیامِ پاکستان سے قبل ہی بلوچستان میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ نیز ان کی قلمی زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہو چکا تھا۔ انور رومان نے گو کہ تاریخی ترجمہ نگاری میں نام کمایا۔ بلوچستان کی تاریخ پہ نہایت اہم کتب کا ترجمہ ان کا شہکار کارنامہ ہے۔ لیکن لکھنے کا آغاز انھوں نے فکشن سے ہی کیا۔ انھوں نے دو درجن سے زائد افسانے، ایک ناول اور چند نثر پارے بھی لکھے۔ ان کا پہلا افسانہ 'ویری ناگ' کے عنوان سے ہفتہ وار 'زمانہ' کوئٹہ کے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کے پرچے میں شائع ہوا۔ یہ ایک آزادی پسند کشمیری مجاہد کی جدوجہد کی داستان بیان کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی برس ان کے دو مزید افسانے 'میں کبھی نہیں بھولوں گا' اور 'سانس' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

۱۹۴۸ء میں ہی عبدالرحمان غور نے 'مشعل' کے عنوان سے ایک مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا۔ جس میں جدید لکھاریوں کی تحریروں کو یک جا کیا گیا تھا۔ یہ ادارۂ ادب سبی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل مجموعے کی قیمت ایک روپیہ درج کی گئی ہے۔ اس میں مجموعی طور پر چار مقالے، تیرہ نظمیں، پانچ افسانے اور چار منظومات شامل ہیں۔ چوں کہ یہ مجموعہ قیامِ پاکستان کے دنوں میں سامنے آیا، اس لیے اس میں اُس عہد کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ افسانوی حصے میں دو افسانے ایسے ہیں جن کا براہِ راست تعلق سن سینتالیس کے فسادات سے ہے۔ اس میں پہلا افسانہ انور رومان کا 'غیر فانی' ہے۔ جس میں مہاجرین کے ایک ریلیف کیمپ کے روح فرسا مناظر بیان ہوئے ہیں۔ جب کہ مسافر سینی کے افسانہ 'طاہرہ' میں فسادات کے پس منظر میں انتہا پسند نظریات کے حامل مسلمان اور ہندوؤں کو یکساں طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی تین افسانے محبت اور رومانس کے موضوعات کے گرد گھومتے ہیں۔ ان میں عبدالحمید زاہد کا افسانہ 'ہنی مون' مرد و زن کی نفسیاتی کشمکش کو بیان کرتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ظفر اپنی پہلی مرحومہ بیوی کی یاد میں دوسری بیوی کی زندگی کو بھی سوگوار بنا دیتا ہے۔ لیکن بالآخر اس کی دوسری بیوی کا خلوص اور نفسیاتی تدبر اس معاملے کو بہتر طور پر حل کر لیتا ہے۔ میکش قادری کا افسانہ 'بیتے لمحے' محبت کی ایک گزشتہ یاد کے بیانیے پر مبنی ہے۔ زینت حیا کے افسانہ 'ادھوری تمنا' کا مرکزی کردار ایسی لڑکی کا ہے جو اپنے بے داغ اور مستحکم کردار سے ایک اوباش نوجوان کو عورت سے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ 'مشعل' کو ایک لحاظ سے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ہندوستان میں شائع ہونے والے اولین افسانوی مجموعہ 'انگارے' سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس میں ہندوستان کے جدید ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں کو یک جا کر کے مرتب کیا گیا تھا۔ جس طرح 'انگارے' اس زمانے میں ہندوستان کے نئے لکھنے والوں کے بدلتے رجحان کی عکاسی کرتا ہے، اسی طرح عبدالرحمان غور کے مرتب کردہ 'مشعل' سے قیامِ پاکستان کے بعد بلوچستان میں اُردو فکشن لکھنے والوں کے رجحانات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اسی زمانے میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے سالانہ جریدہ 'بولان' کا شمارہ بھی ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں مبارک احمد شاہد، شمشاد انور کے افسانے ملتے ہیں۔ 'بولان' کے بعد میں پچاس کی دہائی میں سامنے آنے والے چند پرچوں میں بھی مزید افسانے سامنے آئے۔ سن پچاس کی دہائی میں کوئٹہ سے شائع ہونے والے جریدہ 'معلم' میں بھی اردو افسانے کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ 'معلم' کے نومبر ۱۹۵۰ء کے پرچے میں مسافر سینی کا افسانہ 'نیا ڈوبی جائے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں عبدالرحمان غور کی کہانی 'یہ دنیا والے' شاملِ اشاعت ہوئی۔ جون ۱۹۵۲ء کے پرچے میں عبدالحکیم تارن نے 'شاہِ ایران کی عدل پروری' لکھا۔ فروری ۵۳ء میں نون بھائی مراد آبادی نے 'نمائش کے بعد' لکھی۔ ستمبر ۵۳ء کے شمارے میں غلام نبی افغانی کا افسانہ 'حنا بندی' کے عنوان سے ملتا ہے۔ مئی ۵۴ء میں شاداں امرتسری نے 'خدمت کا صلہ' لکھا۔ اگست ۵۴ء کے پرچے میں زاہد احمد صدیقی کا 'آرزوؤں کا خون' شامل ہوا۔ علاوہ ازیں کوئٹہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'کوہسار' کے مارچ ۱۹۵۳ء کے پرچے میں اقبال سلیم کا افسانہ 'سوالیہ نشان' بھی ملتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں ایک اور مجموعہ سامنے آیا۔ کتاب کا نام تھا: ''وادیء بولان میں''۔ مرتب کرنے والوں میں اختر واحد قاضی، گلزار حسین گلزار، اور افضل کوٹلوی کا نام شامل ہے۔ جب کہ اسے محمد جمیل بھٹی نے اسلامیہ پریس کوئٹہ سے شائع کیا۔ کتاب کے کل صفحات ۱۵۸، اور قیمت ۲ روپے درج ہے۔ اس مجموعے میں کل سات مضامین، تئیس منظومات جب کہ چار افسانے شامل ہیں۔ گو کہ اس کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ 'یہ بلوچستان کی پہلی کتاب ہے'۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر کتابوں کے علاوہ اس نوعیت کا ایک مجموعہ عبدالرحمان غور اس سے سات برس قبل ۱۹۴۸ء میں ہی ترتیب دے کر شائع کر چکے ہیں۔ قطع نظر اس دعوے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ضخیم مجموعہ ہے۔ اس میں بیس لکھاریوں کو شامل کیا گیا۔ جس میں بالخصوص نئے لکھنے والوں کو جگہ دی گئی۔ افسانوں میں عبدالمنان شیخ کا افسانہ 'بیٹی' عصمت فروشی پہ مجبور ہونے والی عورت کے المیے کو بیان کرتا ہے۔ سید اختر شمسی کا افسانہ 'فن کار' ایک ایسے تخلیقی آدمی کی کہانی ہے جو اپنی محبوبہ کی ناگہانی موت کے فراق میں فن کار بن جاتا ہے۔ فضل الٰہی حلیم کے افسانے کا عنوان ہے: 'ادب برائے؟' جس میں انھوں نے ادب کو شہرت کا ذریعہ بنانے والے ادیبوں پر طنز کیا ہے اور ان کے لیے 'ادب برائے شہرت' کی اصطلاح وضع کی ہے۔ آخری افسانہ 'نوکری' کے مصنف ملک محمد صادق ناظر ہیں۔ انھوں نے بے روزگاری کے عفریت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر گو کہ کتاب کا افسانوی حصہ مقداری اور معیاری ہر دو لحاظ سے کم تر ہے۔ لیکن بلوچستان میں اُردو فکشن کے ابتدائی نقوش کے سلسلے میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سن پچاس ہی کی دہائی میں عبدالرحمان غور کے افسانے اور ناولٹ تواتر سے سامنے آئے۔ عبدالرحمان غور نے ہم عصر فکشن نگاروں سے، ماسوائے پاپولر فکشن لکھنے والوں کے، نسبتاً زیادہ لکھا۔ اس لیے ان کی تحریروں میں رجحانات کی عکاسی با آسانی کی جا سکتی ہے۔ سن پچاس سے لے کر سن ستر تک، دو دہائیوں پر مبنی ان کا کام موضوع اور تنوع کے لحاظ سے نہایت اہم اور وقیع ہے۔ اسی زمانے میں بیگم خورشید مرزا کا نام بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے کراچی کے اُس زمانے کے معروف ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ سن پچاس اور ساٹھ کی دہائی کے دوران انہوں نے نصف درجن سے زائد افسانے لکھے۔ جن میں ایک ناولٹ بھی شامل ہے۔ بیگم خورشید مرزا کے افسانے البتہ کتابی صورت میں شائع نہ ہو

سکے۔ جب کہ اس کے بعد سن ساٹھ کا زمانہ پاپولر فکشن کے عروج کا دور تھا۔ اس زمانے میں ڈائجسٹوں اور رسالوں میں افسانوں اور میں قسط وار ناولوں کا چلن عام تھا۔ محبت کی عمومی تثلیث کے مابین گھومتی کہانیاں گھروں میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ہندوستان سے بلوچستان آ کر بس جانے والے چند گھرانوں کی پڑھی لکھی خواتین نے اس ضمن میں پہلا قدم اٹھایا اور بلوچستان میں پاپولر فکشن کی بنیاد ڈالی۔ یاسمین صوفی، حمیدہ جبیں، شاہین روحی بخاری اور بعدازاں رفعت زیبا اس حوالے خاصی معروف ہوئیں۔ ان سب نے ایک سے زائد ناول، بعض نے چند افسانے بھی لکھے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ستر کی دہائی کی آمد سے قبل ہی بلوچستان میں اردو فکشن کی جڑیں مضبوط ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

ابتدائی افسانوی رجحانات:

بلوچستان میں اردو افسانے کے ابتدائی نقوش کی صورت میں ہم نے دیکھا کہ یہاں کی جغرافیائی و معروضی ساخت کے مطابق لکھنے والوں نے عمومی سماجی، سیاسی مسائل کو ہی اپنی تحریروں کا مرکز و محور رکھا۔ محمد عمر بلوچ اور یوسف عزیز مگسی نے سماجی حقیقت نگاری کے جس رجحان سے فکشن کا آغاز کیا تھا، بعدازاں غیر محسوس انداز میں وہی رجحان ہمیں ان کے بعد لکھنے والوں کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

سن اُنیس سو تیس کی دہائی میں اُردو افسانے کے ابتدائی نقوش کے بعد اس کے نمایاں خدوخال ہمیں قیامِ پاکستان کے بعد ہی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اولین افسانوی تصنیف کے بہ طور سید خلیل احمد کا افسانوی مجموعہ 'خمارِ زہر آلود' سامنے آتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں شائع ہونے والا یہ مجموعہ تین طویل ترین افسانوں پر مشتمل ہے۔ سید خلیل احمد واضح طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اس لیے ان کے ہاں ترقی پسند رجحان غالب نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں رومانویت کی زیریں لہریں بھی ساتھ چلتی ہیں۔ جب کہ وہ نفسیاتی انسانی پیچیدگیوں کو بھی کہانی کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے اکثر عنوانات شعری جمالیات سے مزین ہوتے ہیں۔

''خمارِ زہر آلود'' میں شامل پہلا افسانہ 'جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے' ہے۔ یہ قیامِ پاکستان کی ابتدائی راتوں کا قصہ بیان کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار واحد متکلم کی صورت بیان کیا گیا ایک شخص اور اس کا ہم زاد ہے۔ وہ چودہ اگست سن سینتالیس کی رات کو شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں۔ اس دوران آزادی کے نعرے، پرچموں کی لہر، جذباتی تقاریر، عوام الناس کے مجمعے، فٹ پاتھ پہ سوئے لوگ، الغرض ایک وسیع کینوس کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس دوران کہانی میں مزدور، بھنگن، اخبار نویس، بے کار لوگ، تیل مالش اور بوٹ پالش کے کردار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ بنیادی طور پر مصنف نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ محض سرحدوں کی تبدیلی سے انسانوں کی تقدیر نہیں بدلتی، اس لیے سرحدیں نہیں بل کہ نظام بدلنا ضروری ہے۔ افسانوی طرز میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیاسی طنز تھا۔ گو کہ افسانہ کسی مربوط و منظّم پلاٹ سے عاری، مگر ایک تسلسل کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔

دوسرا افسانہ 'خزاں بدوش بہار' ہے۔ یہ تین مرکزی کرداروں کی تثلیث پر مبنی ہے۔ جس میں بنیادی موضوع محبت ہے، لیکن ساتھ میں کائنات کے اسرار اور انسان کے معاشی، سماجی و نفسیاتی مسائل کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار شوکت ایک مصور ہے۔ دو بہنیں نزہت اور طلعت ہیں۔ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ بڑی

بہن نزہت شوخ، چنچل اور زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ شوکت کی محبت میں مبتلا ہے۔ جب کہ دوسری بہن طلعت خاموش طبع ہے۔ وہ ہمہ وقت اداسی میں گھری رہتی ہے۔ شوکت اپنے طرزِ فکر سے دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ دونوں بہنوں کی محبت، شوکت کے فن پر مختلف زاویوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ یوں محبت کی روایتی تثلیث کو نہایت فن کارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کی خاص بات سید خلیل احمد کی کردار نگاری ہے۔ پہلے افسانے کی نسبت اس میں پلاٹ زیادہ منظّم ہے۔ پہلے افسانے میں اگر جزئیات نگاری پر محنت کی گئی ہے تو یہاں کردار نگاری اور جذبات نگاری کو نمایاں کیا گیا ہے۔

تیسرے افسانے کا عنوان ہے: 'درد وہ سنگِ گراں ہے'۔ اس میں متوسط طبقے کی جنسی ناآسودگیوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانی کی مرکزی کردار خالہ کو ایک جنسی ناآسودہ خاتون کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ جو جلد بیوگی کے باعث جنسی کم زوری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کبھی اپنی بیٹی کے عاشق پر تو کبھی اپنے بھانجے پر ڈورے ڈالتی ہے اور بالآخران سے جنسی تعلق قائم کر لیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں رشتوں کے مابین پیدا ہوانے والے نفسیاتی مسائل کو مصنف نے نہایت چابک دستی سے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ خالہ کے علاوہ کہانی کے مرکزی کرداروں میں ان کے بچے ممتاز، سہیل، بھانجا جمیل، ممتاز کا عاشق حسنین شامل ہیں۔ جمیل خالہ سے تعلق قائم کر لینے کے بعد ممتاز کو شادی پہ رضامند کر لیتا ہے اور شادی کے بعد اسے لے کر چلا جاتا ہے۔ ممتاز واپس آتا ہے تو اس پہ یہ خبر بجلی بن کر گرتی ہے۔ وہ خالہ کو کوستا ہے۔ خالہ اس رویے پہ نادم ہوتی ہے اور خودکشی کر لیتی ہے۔ اس سے پریشان ہو کر اس کا بیٹا سہیل بھی نیند کی گولیاں کھا کر اپنا خاتمہ کر لیتا ہے۔ یوں ایک خاندان المیاتی انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر افسانے میں جنسی ناآسودگی کو موضوع بنایا گیا ہے، جو درست راہ نہ پا کر تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ ناجائز جنسی تعلقات جن نفسیاتی پیچیدگیوں کو جنم دیتے ہیں، مصنف نے نہایت مشاکی سے انھیں بیان کیا ہے۔ جیسے ایک منظر میں خالہ کی بیٹی ممتاز، اپنی ماں کی حرکتوں پہ نادم ہو کر حسنین سے کہتی ہے:

> ''نہ جانے امی کو کیا ہو گیا ہے..... مجھے ان سے نفرت سی ہونے لگی ہے..... گھن آتی ہے۔ مجھے جب ان کا خیال آتا ہے تو شرم سے کٹ مرتی ہوں..... مجھے اب گھر کی ہر چیز سے، کھانے سے، پینے سے، گھن محسوس ہوتی ہے..... جیسے ہر چیز نجس اور ناپاک ہو..... بل کہ بعض..... بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے میں آنکھوں دیکھے مکھی نگل رہی ہوں..... اور کھانے کے بعد ابکائی آنے لگتی ہے۔''(۷)

اولین دو افسانوں کی نسبت یہ واحد افسانہ ہے جس میں ایک باضابطہ مکمل پلاٹ، کردار اور مکالموں کا التزام کیا گیا ہے۔ اس لیے نسبتاً اس کی کہانی زیادہ آسان فہم معلوم ہوتی ہے۔ سید خلیل احمد نے بعد ازاں مزید افسانے بھی لکھے۔ ان کا یک افسانہ 'بھابھی' کے عنوان سے لاہور سے شائع ہونے والے معروف ادبی رسالہ 'ادبِ لطیف' کے ۱۹۵۹ء کے سال نامے میں ص ۹۰ پہ شائع ہوا۔ اس میں بے جوڑ شادیوں اور معاشرتی جنسی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جب کہ بعد ازاں ایک اور افسانہ 'مالک' کے نام سے سہ ماہی 'قلم قبیلہ' کوئٹہ کے جولائی تا دسمبر ۱۹۹۴ء کے پرچے میں شائع ہوا۔ یہ علامتی انداز میں لکھا گیا افسانہ ہے، جس میں مذہبی توہم پرستی پہ زبردست طنز کیا گیا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد سامنے آنے والے پہلے اہم افسانہ نگار سید خلیل احمد کے ہاں رومانویت اور سماجی حقیقت نگاری کا ملا جلا رجحان نمایاں نظر

آتا ہے۔ جسے مبارکہ حمید نے 'انقلابی رومانویت' کا نام دیا ہے۔اس کے بعد، پروفیسر انور رومان کی جو ابتدائی افسانوی تحریریں ہمیں ملتی ہیں، ان میں بھی سماجی حقیقت نگاری کا رجحان ہی غالب دکھائی دیتا ہے۔ان کا افسانہ 'ویری ناگ' کشمیری جدوجہدِ آزادی کی عکاسی کرتا ہے۔اس کا مرکزی کردار ایک کشمیری مجاہد ہے۔ جو بیرونی جارحیت کے خلاف نبرد آزما ہے۔ مصنف اسے ایک پہاڑ کی چوٹی پہ بیٹھا ہوا دکھاتا ہے، جہاں وہ اپنی جدوجہد سے متعلق خود کلامی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اس کے تمام تر مکالمے اور گفت گو سماجی صورت حال کے واضح بیانیے پر مبنی ہیں۔ جیسے اس کے اختتامی مکالمے کا ایک حصہ کچھ یوں ہے:

> ''میں کشمیری ہوں، میری زندگی ایک دل فریب تشبیہ ہے لیکن جب تم گولوں اور بموں سے اس تشبیہ کو چکنا چور کرنا چاہتے ہو تو وہی کشمیری چوٹیوں سے لڑھکتا ہوا وہ پتھر ہے جو دندناتا ہوا تمھیں اور تمھارے ان بزدل اوزاروں کو روند ڈالتا ہے.....وہی کشمیری تمھاری فوجوں کی موت ہے، تمھارے وقار کی لاش، تمھارے سام راج کا جنازہ۔''(۸)

دوسرا افسانہ 'میں کبھی نہیں بھولوں گا' اسی زمانے میں کراچی کے رسالہ 'گردو پیش' میں شائع ہوا۔ اس میں بلوچستانی سماج کے طبقاتی کردار کی عکاسی کی گئی ہے۔انور رومان نے اس افسانے میں اُس عورت کو موضوع بنایا ہے جو پاپیادہ کئی میل دور جا کر پانی بھر لاتی ہے اور پھر بھی کم زور و کم تر کہلاتی ہے۔انور رومان افسانے کو استفہامیہ انداز میں کچھ یوں ختم کرتے ہیں کہ، 'کیا یہ دوشیزہ جو اپنی برہنگی کے باوجود حوروں سے زیادہ معصوم اور پاک ہے، پورے بلوچستان کا مجسمہ نہیں؟ پوری صنفِ نازک کی مظہر نہیں؟ پورے انسانی معاشرے کے لیے ایک چیلنج نہیں؟' یوں وہ قاری کے ذہن میں سوال چھوڑ جاتے ہیں جو اسے غور و فکر پہ اور تفکر پہ اکساتے ہیں۔

تیسرا افسانہ 'سانس' کے عنوان سے ماہنامہ 'نوروز' سیالکوٹ میں ستمبر ۱۹۴۸ء کو شائع ہوا۔اس میں کتاب کے ایک شیدائی فضل الٰہی کی کہانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جو سن اُنیس سو کے آغاز میں سیالکوٹ سے کوئٹہ آ کر آباد ہو جاتا ہے۔ وہ کتاب کا اس قدر شیدائی ہے کہ اتنی کتابیں جمع کر لیتا ہے کہ بالآخر ایک دکان کی ضرورت پڑتی ہے۔لیکن وہ کتاب فروش نہیں بننا چاہتا۔ بس جب بھوک لگتی ہے تو کوئی ایک کتاب کسی گاہک کے حوالے کر کے پیٹ کی آگ بجھا لیتا ہے۔ وہ کتابوں کے مطالعے میں اس قدر منہمک رہتا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے خون آشام زلزلے کا بھی اسے پتہ نہیں چلتا اور بالآخر کتابوں کے انبار تلے دب کر مر جاتا ہے۔انور رومان مجموعی طور پر سماجی حقیقت نگاری کے رجحان کے قریب رہتے ہیں۔ ان کی افسانوی تحریروں میں یہی غالب رجحان نظر آتا ہے۔

اس کے بعد سن پچاس کی دہائی کے آغاز میں بہ طور فکشن نگار اہم نام عبدالرحمان غور کا سامنے آتا ہے۔سن پچاس کی دہائی میں ان کا ایک افسانوی مجموعہ اور ایک ناولٹ شائع ہوئے۔عبدالرحمان غور ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔انھوں نے نظم و نثر میں بے پایاں کام کیا۔ان کی کل مطبوعات کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔جس میں افسانے، ناول، شاعری، تحقیق و تنقید، تاریخ اور نثر پارے شامل ہیں۔ باضابطہ تصنیف سے قبل ان کے مختصر افسانے کوئٹہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'معلم'، 'پاسبان'، ہفت روزہ 'تعمیر بلوچستان' مستونگ اور دیگر جرائد میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔اس ضمن میں ان کا پہلا افسانہ ماہنامہ 'معلم' کے نومبر ۱۹۵۰ء کے پرچے میں 'چار ہزار' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ کم عمری کی

زبردستی کی شادی کے موضوع پر مبنی ہے، جس میں ایک لڑکی کا باپ چار ہزار روپے کے عوض اس کی شادی ایک عمر رسیدہ شخص سے کروا دیتا ہے۔ کہانی میں ڈرامائی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ لڑکی کا رونا، سسکنا، اُس کی سہیلی کا اسے تسلی دینا، ان تمام جذبات کو واوین میں بیان کیا گیا ہے جو عموماً ڈرامے کی تکنیک میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی موضوع سے ملتا جلتا افسانہ 'دُرناز' ہفت روزہ 'تعمیر بلوچستان' مستونگ کے یکم مارچ ۱۹۵۴ء کے پرچے میں شائع ہوا۔ دُرناز، مولوی شہاب الدین کی تعلیم یافتہ حسین وجمیل بیٹی ہے۔ اچھے رشتوں کی تلاش میں وہ طویل عرصہ تک اس کی شادی نہیں ہونے دیتا۔ دُرناز اپنے ایک پڑوسی سکول ماسٹر میں دلچسپی لیتی ہے۔ لیکن اس کا باپ اس رشتے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس کے باعث، اس غم میں گھل گھل کر دُر ناز دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں نسوانی جذبات کی نہایت زبردست عکاسی کی گئی ہے۔ 'تعمیر بلوچستان' ہی کے اگلے پرچے میں ان کی ایک اور کہانی 'آگ سلگ رہی ہے' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ جس میں ایک جاگیردار، گاؤں کی ایک لڑکی بختو سے محبت کے جرم میں ایک نوجوان کو قتل کروا دیتا ہے اور ایک ماہ بعد اس لڑکی سے خود شادی کر لیتا ہے۔ مقتول نوجوان کی روح لڑکی کے خواب میں آتی ہے اور اُس سے کہتی ہے:

> ''صبر کرو، وہ دن ضرور آئے گا جب تمھارے جیسی غریب و مظلوم عورتیں کسی ظالم سردار اور جاگیردار کی نفس گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھیں گی۔ وہ قت قریب ہے جب ہمارا ملک ان ظالم لوگوں سے پاک ہو جائے گا۔''(۹)

پھر ۱۵/اپریل ۱۹۵۴ء کے پرچے میں 'وہ بھوکا ہی رہا' کے عنوان سے ملتا ہے۔ اس میں فیضو نامی ایک مرکزی کردار، باپ کی موت کے بعد تیس سال تک کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ آخر کار تنگ دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر شرافت کی زندگی چھوڑ کر ایک ایک طوائف کے کوٹھے پر چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں غربت اور غیر منصفانہ سماجی نظام پہ طنز کیا گیا ہے۔ اپریل ۱۹۵۴ء ہی کے ماہنامہ 'معلم' کے پرچے میں ان کا افسانہ 'پتھر کا دل' شائع ہوا۔ جس میں ایک اخبار کے ایڈیٹر اور نام ور ادیب و شاعر اپنی محبت میں مبتلا ثریا کو خط لکھ کر محبت کی بجائے وطن کے فرض کو ترجیح دینے کو کہتا ہے۔ افسانہ، خط کی طرز میں لکھا گیا ہے۔ اس سے ایک اقتباس کا حوالہ اس لیے بھی ضروری ہوگا کہ اس سے نہ صرف اُس عہد کے لکھنے والوں کی ترجیحات کا اندازہ ہوتا ہے بل کہ یہ وہ طرز تھا، جسے بعد میں لکھنے والوں نے مختلف صورتوں میں برتا۔ ایڈیٹر یا ادیب، اپنی محبوبہ کو خط میں لکھتا ہے:

> ''ثریا، مجھے معاف کر دو۔ میں اب تمھارے پاس کبھی نہیں آؤں گا، میں تمھارے لیے نہیں ہوں۔ میرے حالات مجھے اجازت نہیں دیتے کہ پھر تم سے ملوں.....اس حالت میں تمھارے پاس کیسے آ سکتا ہوں۔ اور آ بھی جاؤں تو ممکن ہے کہ اپنے مقصد کو تمھاری محبت کی تکمیل میں کھو بیٹھوں! پھر تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔''(۱۰)

یہ ایک طویل خط ہے، جس میں غور صاحب نے جذبات نگاری میں تو کمال کیا ہی ہے، ساتھ ہی اُس عہد کے سماجی، سیاسی حالات کی بھی زبردست عکاسی کی ہے۔ محبت اور سماجی فریضے کے مابین جھولتے ایک حساس لکھنے والے کے جذبات کے اظہار پر مبنی یہ وہ خیال ہے، جو بعد ازاں ہمارے ادب کا ایک نمایاں جزو رہا ہے، اور بیش تر لکھنے والوں نے اس

پہ اپنے اپنے انداز میں طبع آزمائی کی۔ 'معلم' کے آئندہ ماہ مئی ۱۹۵۴ء کے پرچے میں ان کی ایک اور کہانی ''زندگی کا پُل'' شائع ہوئی۔ یہ ایک اسٹیشن ماسٹر انعام الحق کی نیک سیرت، انسان دوست اور بہادر بیٹی ممتاز کی کہانی ہے۔ ندی میں سیلاب کے باعث پُل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس دوران دوسرے اسٹیشن سے مسافر ٹرین روانہ ہو چکی ہے، اس لیے اسٹیشن ماسٹر شدید پریشانی کے عالم میں ہے۔ تب اس کی بیٹی اس کی ہمت بندھاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ مل کر پُل کی مرمت کو ممکن بناتی ہے۔ ٹرین کے قریب آنے تک پُل تو مکمل ہو جاتا ہے لیکن ممتاز اس دوران تفکرات میں گم ہونے کے باعث چکرا کر ندی میں گر جاتی ہے۔ ایک نوجوان اسے ندی سے نکال لاتا ہے، لیکن تب تک وہ مر چکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد 'تعمیر بلوچستان' کے ۱۸ر جون ۱۹۵۴ء کے پرچے میں ان کا افسانہ 'مورچھل' شائع ہوا۔ اس میں بارہ سال کی ایک لڑکی مورچھل اور عاقل خان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ مورچھل کم عمری کی شادی کے باعث خوف زدہ ہوتی ہے۔ لیکن اتفاق سے عاقل خان ایک پڑھا لکھا اور عاقل انسان ثابت ہوتا ہے۔ وہ اسے تسلی دیتا ہے کہ وہ اسے بھی پڑھائے گا اور وہ مل کر اپنے ملک میں فرسودہ روایات کے خاتمے کی جدوجہد کریں گے۔ اس کہانی میں سماجی رسومات کی فرسودگی کے علاوہ اصلاحی رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر ۱۹۵۴ء عبدالرحمان غور کی تخلیقی زندگی کا بھرپور سال ثابت ہوا۔ اس برس انھوں نے نصف درجن سے زائد افسانے لکھ ڈالے۔ اسی سے شہہ پا کر اگلے برس انھوں نے اپنے افسانوں کی کتاب شائع کر ڈالی۔ جس میں چند مطبوعہ افسانوں کے علاوہ بیش تر غیر مطبوعہ افسانے شامل کیے۔ عبدالرحمان غور نے ادارۂ ادب بلوچستان کے نام سے ایک اشاعتی سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کی اکثر کتابیں اسی ادارہ کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۵۵ء میں 'ناقابلِ فراموش ہستیاں' کے عنوان سے سامنے آیا۔ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے درج ہے۔ کتاب کا مقدمہ م، س نوشیروانی نے لکھا ہے۔ اس میں کل سترہ افسانے شامل ہیں۔ اکثر افسانوں کے موضوعات سماجی مسائل کے گرد ہی گھومتے نظر آتے ہیں۔ عبدالرحمان غور کے ہاں دوسرا حاوی رجحان رومانویت کا ہے۔ ان کی کہانیوں میں رومان کی جھلکیاں واضح دیکھی جا سکتی ہیں۔ افسانہ 'ایک شہر ایک محبت' ہلکے پھلکے رومانوی انداز میں لکھی گئی کہانی ہے۔ جس کا مرکزی کردار رضیہ اپنی ایک آئیڈیل شخصیت کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ لیکن والدہ کی شدید مخالفت کے باعث اسے پا نہیں سکتی اور آخر کار تپ دق میں مبتلا ہو کر رخصت ہو جاتی ہے۔ ایک اور افسانہ 'میری روح' میں راشد نامی نوجوان ایک مغرور لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس کی مسلسل بے اعتنائی کے باعث راشد بسترِ مرگ سے آ لگتا ہے۔ افسانہ 'وہ کون تھی' کم عمری کی بے جوڑ شادی کی قبیح رسم کو موضوع بناتا ہے۔ اسی طرح ان کے دیگر افسانوں میں بھی سماجی حقیقت نگاری اور رومانوی رجحانات ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ جیسے کہ تین ساتھی، ایک سو سال بعد، مورچھل، وہ بھوکا ہی رہا میں سماجی اور معاشی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے تو ایک محبت ایک مقصد، ڈھلکا ہوا آنسو، میں وہ محبت کی سماجی پیچیدگیوں کو موضوع بناتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ اسی سال اپریل میں خط کی طرز میں لکھا گیا ان کا نیم رومانوی و نیم سماجی ناولٹ 'عالیہ' کے نام سے سامنے آیا۔ اس کی ضخامت ۸۰ صفحات اور قیمت سوا روپیہ ہے۔ یہ بھی ادارۂ ادب بلوچستان کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ جب کہ مطبوعہ البرٹ پریس کوئٹہ درج ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک گم نام ادیب ہے جس کی منگنی عالیہ نامی ایک لڑکی کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔ لیکن شادی کے لیے لَب کے نام پر جہیز کی خطیر رقم مہیا نہ کرنے پر وہ

مایوس ہو کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ ایک طرف عالیہ اس کی محبت میں گھلنے لگتی ہے تو دوسری جانب مصنف کا بھی حال برا ہے۔ فرقت کے ان ہی ایام میں وہ اپنے دل کا حال خط کی صورت میں اسے لکھتا ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک رومانوی کہانی ہے لیکن غور نے نہایت فن کارانہ انداز میں بلوچستان کے سماجی مسائل کو اس طرح اس میں پرو دیا ہے کہ وہ کہانی کا ہی حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ یوں یہ نیم رومانوی و نیم سماجی حقیقت نگاری کے رجحان پر مبنی ایک ایسی کہانی بن جاتی ہے، جس میں بہ ظاہر تو دو جوان دھڑکتے دلوں کا رومانس حاوی رہتا ہے لیکن ساتھ ہی سماجی مسائل کی عکاسی زیریں لہر کے طور پر ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ عبدالرحمان غور کی اسی فن کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے انعام الحق کوثر نے ان سے متعلق یہ درست رائے قائم کی کہ،

''غور کا فن اہمیت کے لحاظ سے افادیت کا حامل ہے۔ ان کے مختصر ناول ہوں یا افسانے، زیادہ تر مقامی کردار اور ماحول پیش کرنے کے علاوہ سیاسی اور سماجی مسائل کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔''(۱۱)

اس عہد میں ایک نام ظفر مرزا کا بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔ یہ ۱۹۵۵ء کا زمانہ تھا۔ ان کے افسانے معروف ادبی جریدہ 'ماہِ نو' اور دیگر جرائد میں شائع ہوئے۔ جب کہ وہ زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج کے جریدہ 'بولان' کے ادبی حصے کے رکن بھی رہے۔ ظفر مرزا بعد ازاں ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔ وہ ریڈیو پاکستان خضدار کے اسٹیشن ڈائریکٹر رہے۔ جہاں انھوں نے بعد ازاں بیش تر افسانے براہوی میں لکھے۔ یہاں ان کے اُن اردو افسانوں کا تذکرہ مقصود ہے جو پچاس کی دہائی میں شائع ہوئے۔

اس ضمن میں ان کا پہلا افسانہ گورنمنٹ کالج کے جریدہ 'بولان' (اشاعت دسمبر ۱۹۵۵ء، جلد ۷، شمارہ ۱) کے ص نمبر ۶۵ پر نظر آتا ہے۔ افسانے کا عنوان ہے: ''سحر ہونے تک''۔ افسانے میں دو اجنبی لوگوں کو نا گہانی طور پر ایک جگہ رات گزارنی پڑتی ہے۔ یوں دونوں اس طوفانی رات میں ایک دوسرے کو اپنی دکھ بھری سرگزشت سناتے ہیں۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کا قصہ ہے۔ جب تقسیم کے متوقع اعلان کے ساتھ ہی فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ پہلا شخص بتاتا ہے کہ وہ ایسے ہی ایک حملے میں زخمی ہوا۔ اس کی بیٹی اغوا کر لی گئی۔ غربت کے باعث نوبت فاقہ کشی تک آ پہنچی۔ حتیٰ کہ وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ دوسرا شخص بتاتا ہے کہ وہ ایک خوش حال زندگی گزار رہا تھا لیکن زمانے کے ہاتھوں مصائب سے دوچار رہا۔ یہاں تک کہ تنگ دستی کا عالم ہو گیا۔ اسی عالم میں اس کا بیٹا سسک سسک کر مر گیا۔ بیوی قریب المرگ ہے اور وہ اب کوئلے کی کان میں مزدوری پر مجبور ہے۔ افسانے میں اُس عہد کے سیاسی، سماجی حالات کے ساتھ ساتھ سماجی نابرابری اور طبقاتی نظامِ تقسیم کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ اپنی بُنت اور رویے میں ترقی پسند رجحان کا حامل ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ 'بولان' کے ۵۷۔۱۹۵۶ء کے پرچہ (جلد ۸، شمارہ ۱، ص ۳۴) پہ نظر آتا ہے۔ افسانے کا عنوان ہے: 'اور پتے گرتے رہے'۔ افسانے کے تین مرکزی کردار اکرم، جاوید اور سلطان ایک ہی دفتر میں ملازم ہیں۔ تینوں تن خواہ کی رقم مہینے کے شروع کے دنوں میں ہی غیر ضروری چیزوں پر خرچ کر لیتے ہیں اور پھر ضروری چیزوں کے لیے بھی مہینہ بھر پریشان رہتے ہیں۔ یہ متوسط طبقے کی کہانی ہے، لیکن طبقاتی نظام اور سرمایہ دارانہ منڈی کی معیشت کو بھی نشانہ بناتی ہے۔ جس میں غیر ضروری اشیا کو فیشن کے ذریعے لوگوں کے لیے ضروری بنا دیا جاتا ہے۔ لوگ محض دیکھا دیکھی میں ضرورت سے زیادہ پاؤں پھیلا لیتے ہیں، جس کے بعد انھیں اضافی محنت درکار ہوتی ہے۔ یہ اضافی محنت قدرِ زائد پیدا کرتی ہے، جس کا فائدہ بالآخر سرمایہ کار ہی اٹھاتا

ہے۔ظفر مرزا کے افسانوں میں بنیادی طور پر سماجی حقیقت نگاری کا ترقی پسند رجحان ہی غالب نظر آتا ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں بلوچستان کے فکشن پر مجموعی طور پر خواتین لکھاریوں کا غلبہ رہا۔ یاسمین صوفی، شاہین روحی بخاری، حمیدہ جبیں، شیریں ناز اور رفعت زیبا وغیرہ نے اس زمانے میں دھڑا دھڑ ناول لکھے۔ گو کہ انھیں پاپولر فکشن کی ذیل میں رکھا جاتا ہے، لیکن بلوچستان میں اُردو کے افسانوی ادب کے ارتقا میں انھیں کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی زمانے میں ہمیں خواتین کی صف میں اولین اور نمایاں نام بیگم خورشید مرزا کا نظر آتا ہے۔ جنھوں نے اُس زمانے میں تعداد میں کم لیکن نہایت معیاری افسانے لکھے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے مطابق، بیگم خورشید جہاں، بانی علی گڑھ مولانا شیخ عبداللہ کی صاحب زادی اور معروف ترقی پسند خاتون ڈاکٹر رشید جہاں کی بہن تھیں۔ یوں ادبی ذوق انھیں ورثے میں ملا تھا۔ خود بھی انھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ شوہر پولیس میں افسر تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ تعیناتی کے سلسلے میں ہی وہ کوئٹہ میں مقیم رہیں اور افسانے لکھ کر نام کمایا۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے فیچرز اور ڈرامے بھی لکھے۔ ریڈیو پاکستان کے خواتین کے پروگرام میں باقاعدہ حصہ لیتی رہیں۔ ان کا پہلا افسانہ 'آپی' کے نام سے کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'ساقی' کے ۱۹۶۰ء کے سالنامہ میں نظر آتا ہے۔ آپی، ۱۷ سالہ لڑکی ہے، جس کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی حلیم الطبعی سے گھر والوں اور اہلِ خانہ کا دل موہ لیتی ہے۔ شوہر کا ہر ممکن خیال رکھتی ہے، لیکن اس کا شوہر رات بھر کلب میں دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے اور دیر گئے گھر لوٹتا ہے۔ افسانے میں عورت کے ایثار اور قربانی کے جذبے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

خورشید جہاں وہ اولین خاتون لکھاری بھی ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں بلوچستان کے مقامی رنگ، اور ثقافتی مظاہر کو اپنایا۔ اس ضمن میں ان کا پہلا افسانہ 'رواج' کے نام سے کراچی سے شائع ہوانے والے ماہنامہ 'ساقی' ہی کے افسانہ نمبر میں ۱۹۶۱ء کو شائع ہوا۔ فیض محمد، دین محمد، فیض کی دو بیویاں کتورا اور بختاور کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ فیض محمد نرینہ اولاد کے چکر میں چودہ سالہ بختاور سے دوسری شادی رچاتا ہے اور بدلے میں اپنی چودہ سالہ بیٹی اس کے بھائی دین محمد سے بیاہ دیتا ہے۔ یوں دونوں خاندان لَب کی رسم سے تو بچ جاتے ہیں لیکن دونوں خاندان ہمہ وقت معاشرتی مسائل کا شکار رہتے ہیں۔ اس افسانے میں بلوچستان میں عورتوں کی شادی کے وقت جہیز کے بہ طور وصول کی جانے والی رسم لب (یا ولور)، نیز کم عمری کی بے جوڑ شادیوں کی رسم کے المیاتی پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کہانی میں تعویز گنڈے، نسوار کا استعمال اور گڑ والی قہوہ چائے کا تذکرہ اس کے مقامی لوکیل کو نمایاں کرتا ہے۔

'ساقی' کے اسی سال نامہ میں ان کا ایک اور مختصر افسانہ 'چوڑی والا' کے عنوان سے ملتا ہے۔ اس میں ایک چوڑی بیچنے والے کی حب الوطنی اور مذہبی جذبے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگلے سال (۱۹۶۲ء میں) 'ساقی' کے ناولٹ نمبر میں ان کا طویل افسانہ 'روبی' شائع ہوا۔ جو ایک عورت کے ازدواجی و خانگی مسائل کے گرد گھومتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار، روبینہ یا روبی شک کی بیماری میں مبتلا ہے۔ یہ شک اسے شوہر کے خلاف ہمہ وقت جاسوسی پہ اکسائے رکھتا ہے، جس سے اس کی خانگی زندگی اتھل پتھل کا شکار رہتی ہے۔ روبی کے علاوہ اس کا شوہر افتخار اور اس کی سہیلیاں چندا، مسز مہتا اور مسز نند کمار، کہانی کے دیگر کرداروں میں نمایاں ہیں۔ یہ ساری کہانی ایک بحری جہاز کے منظر نامے میں لکھی گئی ہے۔ جس میں سمندر کے مختلف مناظر کی عکاسی نہایت رومانوی انداز میں ہوئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ ایسا ہی منظر بیان کرتے ہوئے

لکھتی ہیں:

''دور اُفق پر آسمان جھکا ہوا اپنی گرم و گرد آلود پیشانی کو کس طرح سمندر کی ٹھنڈی موجوں سے تر کر رہا ہے۔ کس طرح آسمان کا ہلکا نیلا رنگ سمندر کے زیادہ گہرے رنگ میں اس طرح ملنے کی کوشش کر رہا ہے، جیسے وہ دوئی کو مٹا کر ایک ہو جانا چاہتا ہو۔''(۱۲)

نومبر ۱۹۶۶ء کے 'ساقی' میں ان کا افسانہ 'عورت نوری بھی ہے ناری بھی ہے' کے طویل عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں ایک بار پھر بلوچستان میں رائج عورت دشمن رسومات کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ مرکزی کردار محمد انور بیوی کے مرجانے کے بعد دوسری شادی کرنے کے لیے اپنی بیٹی کو ایک بوڑھے اور بھینگے شخص کے ہاتھوں ایک ہزار روپے میں فروخت کر دیتا ہے۔ جب کہ دوسری بیٹی فاطمہ کی شادی ٹانگوں سے معذور ایک شخص سے کر کے، بدلے میں اس کی بہن سے دوسرا بیاہ رچا لیتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ بیگم خورشید مرزا کے ہاں گو کہ عورت ہی مرکزی موضوع رہتی ہے لیکن ساتھ میں وہ بلوچستان کے مقامی لوکیل کو بھی اپنی کہانیوں کا حصہ بناتی ہیں۔ رجحان کے لحاظ سے ان کی کہانیاں سماجی اور رومانوی رجحان کے قریب تر نظر آتی ہیں۔ پچاس کے اواخر اور ساٹھ کی دہائی کے آغاز کے فکشن نگاروں میں ہمیں ایک اہم نام یاسمین صوفی کا ملتا ہے۔ جنھوں نے یکے بعد دیگرے گیارہ ضخیم ناول لکھے۔ اُس زمانے میں ڈائجسٹوں اور رسالوں میں پالولر فکشن کا رواج اپنے عروج پر تھا۔ بلوچستان سے چند خواتین نے اس میں خوب نام کمایا۔ یاسمین صوفی مقدار و تعداد کے لحاظ سے ان میں سب سے نمایاں ہیں۔ اسی زمانے میں ناول نگاری میں شاہین روحی بخاری، حمیدہ جبیں، شیریں ناز اور بعد ازاں رفعت زیبا نے بھی شہرت حاصل کی۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں یاسمین صوفی کے یکے بعد دیگرے درجن بھر ناول سامنے آئے:

''ان کے کچھ ناول اصلاحی اور کچھ رومانی تھے۔ اصلاحی ناولوں میں وہ عورت کی عظمت کی علم بردار نظر آتی ہیں۔''(۱۳)

عورت کے مختلف پہلو ہی ان کے ناولوں کا نمایاں موضوع ہے۔ ان کے ناولوں کے اکثر مرکزی کردار خواتین ہی ہیں۔ وہ عورت کی محبت، بے وفائی، دھوکہ، ایثار، قربانی اور خلوص کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ اُنیس سو ساٹھ اور ستر کی دہائی میں یاسمین صوفی قارئین کے وسیع حلقے میں مقبول رہیں۔ علاوہ ازیں ۱۹۶۶ء میں ان کا ایک افسانوی مجموعہ بھی شائع ہوا، جس میں دس کہانیوں سمیت سات مضامین بھی شامل ہیں۔ 'فانوسِ ادب' کے نام سے یہ کتاب نیازی پبلشرز، انارکلی، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں بنیادی طور پر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانیوں اور مضامین میں جنگ سے متعلق چھوٹوں اور بڑوں کے ملی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یاسمین صوفی کو رومانوی اور اصلاحی رجحان کی حامل افسانہ نویس قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے بیش تر ناولوں اور افسانوں میں یہی رجحان غالب نظر آتے ہیں۔

حمیدہ جبیں کے ناول بھی اسی زمانے میں معروف ہونا شروع ہوئے۔ ان کے نصف درجن سے زائد ناولوں میں عورت ہی مرکزی کردار ہے۔ بل کہ اُس زمانے کے مروجہ رواج کے مطابق ان کے اکثر ناولوں کا عنوان ہی کسی زنانہ نام پہ ہے۔ (جیسے: دیبا، روبی، شمائلہ، عنبرین، وغیرہ)۔ عورت کی محبت اور اس کے ساتھ مرد کا کرخت رویہ، محبت میں دھوکا و فریب، وغیرہ ان کے ناولوں کے مرکزی موضوعات ہیں۔ جن میں اکثر وہ عورت کو بے گناہ ہی دکھاتی ہیں۔ گویا مجموعی طور

پران کے ہاں بھی رومانویت اور سماجی اصلاح کا رجحان ہی غالب رہتا ہے۔

شاہین روحی بخاری بھی اسی زمانے میں کہانیاں اور ناول لکھنے کا آغاز کر چکی تھیں۔ان کے بعض افسانے اور ناول مختلف اخبارات ورسائل میں قسط وار شائع ہو رہے تھے۔شاہین روحی بخاری کے ہاں بھی رومانویت اور سماجی اصلاح کے رجحانات ہی غالب نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں بالخصوص سماج میں عورت کے ساتھ پیش آنے والے سماجی رویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔شاہین روحی بخاری چوں کہ بنیادی طور پر صحافی ہیں اور ادب کے میدان میں آنے سے قبل ہی وہ ایک معروف خاتون صحافی کے بہ طور اپنا نام اور مقام پیدا کر چکی تھیں،اس لیے انھیں ادبی میدان میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔بل کہ صحافت سے تعلق نے ان کی ادبی پرداخت میں سہولت پیدا کی۔انعام الحق کوثر،ان سے متعلق احمد ندیم قاسمی کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

> ''شاہین روحی فیشن ایبل ادب کی زد میں نہیں آئی بل کہ آغاز ہی سے جو کچھ لکھا،اپنی ذات کے حوالے سے اور اپنے ہی مشاہدات،تجربات اور محسوسات کے حوالے سے لکھا۔''(۱۴)

رفعت زیبا بھی اسی زمانے میں ادبی دنیا میں قدم رکھ چکی تھیں۔انھوں نے پہلے افسانے اور پھر ناول لکھے۔گو کہ ان کے مجموعے سن ستر کی دہائی کے بعد شائع ہوئے،لیکن ان کی ابتدائی تحریریں سن ساٹھ کی دہائی کے وسط میں سامنے آنا شروع ہو چکی تھیں۔ان کے ہاں بھی غالب رجحان سماجی اصلاح کا ہے۔البتہ انھوں نے مقامیت کو بھی تحریر کا حصہ بنایا۔انھوں نے مقامی رسم و رواج سمیت مقامی شہروں ، اداروں اور چیزوں کے نام بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے۔بل کہ فرسودہ روایات سے متعلق بعد ازاں ان کا ایک مکمل ناول 'رواج' کے نام سے سامنے آیا۔

اس کے علاوہ گو کہ خادم میرزا اور طاہر محمد خان بھی اس زمانے میں افسانہ نگاری شروع کر چکے تھے۔لیکن ان کے افسانے ستر کی دہائی کے بعد ہی منظر عام پر آئے۔سن ۱۹۷۱ء سے قبل نمایاں لکھنے والوں میں سید خلیل احمد، پروفیسر انور رومان،عبدالرحمان غور،بیگم خورشید مرزا،یاسمین صوفی اور حمیدہ جبیں وغیرہ شامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انعام الحق کوثر، بلوچستان میں اردو، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۷۲ء)، ص ۵۱۵

۲۔ یوسف عزیز مگسی، تکمیل انسانیت، (کوئٹہ: یوسف عزیز مگسی چیئر، بلوچستان یونی ورسٹی، ۲۰۱۶ء)

۳۔ ضیاالرحمان، کیا تکمیلِ انسانیت بلوچستان کا پہلا افسانہ ہے؟ مشمولہ: قلم قبیلہ، (کوئٹہ: قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ، ۲۰۰۶ء)، جلد ۲۸، شمارہ ۱، ص ۵۴

۴۔ ایضاً، ص ۵۸

۵۔ مبارکہ حمید، بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، (کوئٹہ: روبی پبلشرز، ۲۰۰۰ء)، ص ۳۴

۶۔ ایضاً، ص ۳۵

۷۔ خلیل احمد، خمارِ زہر آلود، (کوئٹہ: قلات پبلشرز، ۱۹۴۸ء)، ص ۳۸۷

۸۔ انور رومان، ویری ناگ، مشمولہ: ہفت روزہ زمانہ، (کوئٹہ: زمانہ پریس، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء)، ص ۴

۹۔ عبدالرحمان غور، آگ سلگ رہی ہے، مشمولہ: ہفت روزہ تعمیر بلوچستان، (کوئٹہ: تعمیر بلوچستان پریس، ۱۹۵۴ء)، جلد ۲، شمارہ ۱۵، ص ۶

۱۰۔ عبدالرحمان غور، پتھر کا دل، مشمولہ: ماہنامہ معلم، (کوئٹہ: مولانا عبدالباقی دُرخانی، سرآب روڈ، ۱۹۵۴ء)، ص ۶

۱۱۔ انعام الحق کوثر، بلوچستان میں اردو، ص ۵۵۰

۱۲۔ بیگم خورشید مرزا، روبی، مشمولہ: ماہنامہ ساقی، (کراچی: ۱۹۶۲ء)، جلد ۶۵، شمارہ ۲، ص ۶۵

۱۳۔ شاہدہ بخاری، یہ پیارے لوگ، (کوئٹہ: قلات پبلشرز، ۲۰۰۴ء)، ص ۴۷

۱۴۔ انعام الحق کوثر، بلوچستان میں اردو، ص ۲۰۳